پروفیسر افتخار حسین صدیقی

احیائے اسلام کی فکری اساس

۱۔ دینی اعتبار سے جو فکری اساس اسلام کی ہے، وہی عصرِ حاضر میں اس کے احیا کی ہے۔ ابدی سچائیاں وقت کے ساتھ بدلتی نہیں بلکہ ہر آن تیزی سے بدلتی ہوئی اس دنیا میں مضبوطی سے قدم جما کر آگے بڑھنے کا حوصلہ بخشتی ہیں۔ زمانہ اگر ساتھ نہ دے تو اس کا مقابلہ کرنے کے لیے عزم و ہمت عطا کرتی ہیں۔ لیکن ہوتا اکثر یہ ہے کہ "زمانہ با تو نہ سازد تو بہ زمانہ بستیز" کے اصول پر عمل کرنے کے بجائے ہم زمانے کی رو میں بہہ جاتے ہیں اور ان ابدی سچائیوں کا دامن ہمارے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے، ہم انھیں فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ حرم کو چھوڑ کر دیر میں اپنے دل کا درماں تلاش کرتے ہیں، لیکن درد ہے کہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور بالآخر یہ درد خود ہی درماں بن جاتا ہے۔ کعبے سے منہ موڑ کر صنم کدہ آباد کرنے کے مہلک نتائج جب ہمارے سامنے آتے ہیں تو ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور یہ "احساسِ زیاں" ہی پھر ہمیں کعبے کا راستہ دکھاتا ہے۔ یہ ہے عصرِ حاضر میں احیائے اسلام کی اساس، جس کی نوعیت خالصتاً جذباتی ہے فکری نہیں۔ اس کی فکری اساس، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، وہی ہے جو خود اسلام کی ہے جس کی طرف بعد میں رجوع کروں گا۔

۲۔ احیائے اسلام کی موجودہ عالم گیر تحریک سامراجیت اور اشتراکیت کے تباہ کن معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی نتائج کے خلاف ایک شدید جذباتی ردِعمل ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں اس ردِعمل کا آغاز اقبال کے عالمی امن کے اس پیغام سے ہوا جو یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا ریڈیو، لاہور سے نشر ہوا۔

" دورِ حاضر کو علومِ عقلیہ اور سائنس کی عدیم المثال ترقی پر بڑا فخر ہے اور یہ فخر یقیناً حق بجانب ہے۔ آج زماں اور مکاں کی پنہائیاں سمٹ رہی ہیں اور انسان نے فطرت کے اسرار کی نقاب کشائی اور تسخیر میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن اس تمام ترقی کے باوجود اس زمانے میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، قومیت، اشتراکیت، فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخِ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ جن نام نہاد مدبروں کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سپرد

کی گئی ہے، وہ خوں ریزی، سفاکی اور زیر دست آزادی کے دیوتا ثابت ہوئے ہیں ۔ جن حاکموں کا فرض یہ تھا کہ اخلاقِ انسانی کے نوامیسِ عالیہ کی حفاظت کریں، انسانوں کو انسانوں پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی اور علمی سطح کو بلند کریں، انھوں نے ملوکیت اور استعمار کے جوش میں لاکھوں، کروڑوں بندگانِ خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا، صرف اس لیے کہ ان کے اپنے مخصوص گروہ کی ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا جائے ۔ انھوں نے کمزور قوموں پر تسلط حاصل کرنے کے بعد ان کے اخلاق، ان کے مذہب، ان کی معاشرتی روایات، ان کے ادب اور ان کے اموال پر دستِ تطاول دراز کیا ۔ پھر ان میں تفرقہ ڈال کر ان بدبختوں کو خوں ریزی اور برادر کشی میں مصروف کر دیا تاکہ وہ غلامی کی افیون سے مدہوش اور غافل رہیں اور استعمار کی جونک چپ چاپ ان کا لہو پیتی رہے . . . اس دنیا کے ہر گوشے میں چاہے وہ فلسطین ہو یا حبش، ہسپانیہ ہو یا ایک قیامت برپا ہے ۔ لاکھوں انسان بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارے جا رہے ہیں ۔ سائنس کے تباہ کن آلات سے تمدنِ انسانی کے عظیم الشان آثار کو معدوم کیا جا رہا ہے اور جو حکومتیں فی الحال آگ اور خون کے اس تماشے میں عملاً شریک نہیں ہیں، وہ اقتصادی میدان میں کمزوروں کے خون کے آخری قطرے تک چوس رہی ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا ہی میں یوم حشر آپہنچا ہے ۔ ہر شخص نفسا نفسی کر رہا ہے اور کسی دوسرے کے لیے محبت اور ہمدردی کی کوئی آواز سنائی نہیں دیتی ۔ تمام دنیا کے اربابِ فکر دم بخود سوچ رہے ہیں کہ تہذیب و تمدن کے اس عروج اور ترقی کے اس کمال کا انجام یہی ہونا تھا کہ انسان ایک دوسرے کی جان و مال کے دشمن بن کر کرۂ ارض پر زندگی کا قیام ناممکن بنا دیں "

یہ ہیں وہ حالات جنھوں نے مسلمان کو مسلمان کر دیا ۔ اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ انسان کی نجات نہ جمہوریت میں ہے اور نہ اشتراکیت میں ۔ اس کی فلاح اسلام میں ہے اور صرف اسلام میں ۔ اس کی بقا انسانیت کے احترام میں ہے جس کی تلقین محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبے میں ہی کی ۔ چنانچہ اقبال اسی خطبے کی روشنی میں عالمی امن کے نام پر دنیا کو عزم و یقین سے بھرپور یہ پیغام دیتے ہیں:

" انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے ۔ جب تک تمام دنیا کی علمی قوتیں اپنی توجہ کو محض احترامِ انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کر دیں، یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی رہے گی ۔ کیا ہم نے نہیں دیکھا کہ ہسپانیہ کے باشندے ایک نسل، ایک زبان، ایک مذہب اور ایک قوم رکھنے کے باوجود محض

اقتصادی مسائل کے اختلاف پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں اپنے تمدن کا نام و نشان مٹا رہے ہیں۔ اس ایک واقعے سے صاف ظاہر ہے کہ قومی وحدت کبھی ہرگز قائم و دائم نہیں۔ وحدت صرف ایک ہی محترم ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے، جو رنگ و نسل و زبان سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو مٹایا نہ جائے گا، جب تک انسان اپنے عمل سے، تعلق عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا، جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو مٹایا نہ جائے گا، اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکے گا اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ معنی نہ ہوں گے۔"

یہ پیشین گوئی اقبال نے ۱۹۳۸ء میں کی تھی۔ آج بیالیس سال کے بعد حالات بد سے بدتر ہو گئے ہیں۔ ایٹمی ہتھیاروں کے تیزی سے بڑھتے ہوئے پھیلاؤ اور اپنی اپنی سیاسی اور معاشی برتری قائم کرنے کے لیے دو بڑی طاقتوں کی آپس میں بڑھتی ہوئی آویزش نے دنیا کو تباہی کے غار کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ انسانیت کا درد رکھنے والے مغرب کے ماہرینِ تعلیم پر اس جارحانہ قوم پرستی کا یہ اثر ہوا کہ انھوں نے اب قومی معاشروں اور ملکی ثقافتوں کی بات کرنی چھوڑ دی ہے اور وہ اس محدود دائرے سے نکل کر عالمی سطح پر ایک وسیع انسانی معاشرے اور ثقافت کی تشکیل کا پرچار کرنے لگے ہیں کہ ان کے نزدیک دنیا کی نجات اب صرف "عالمی ثقافت" ہی کی تشکیل میں ہے۔ یہ ماہرینِ تعلیم دنیا کو تباہی سے بچانے کی خاطر اس کی "تعمیر نو" کے خیالی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوشاں ہیں۔ ان میں تھیوڈور بریملڈ (THEODORE BRAMELD) کی مساعی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مسلمانوں پر اس تحریک کا ردِ عمل یہ ہوا کہ انھوں نے پھر آغوشِ اسلام میں پناہ لی۔ جو "تعمیرِ نو" کے حامیوں کی طرح انھوں نے "عالمی ثقافت" کا خواب نہیں دیکھا، کیوں کہ ان کا دین خود "احترامِ آدمیت" کا دین ہے جو لادینی "عالمی ثقافت" کے منصوبے کے مقابلے میں ان کے لیے زیادہ قابلِ عمل اور جذباتی اعتبار سے زیادہ تسکین بخش ہے۔

۳۔ اب آئیے فکری سطح پر اسلام کی اساس کی طرف جو اس کے احیا کی لازمی شرط ہے۔ اسلام دینی عینیت (IDEALISM) پر مبنی ایک مکمل نظامِ حیات ہے۔ عینیت میں [illegible] کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اسلام کا نظامِ حیات توحید کے تصور کی تفسیر ہے۔ یہ تصور اخلاقی اور روحانی قدروں کو زندگی کا اصل محرک قرار دیتا ہے۔ انسان کو جب ان کا مکمل ادراک [illegible] اس کی فکر اساس

اور ارادے سب پر حاوی ہو جاتا ہے۔ تصور میں بے پناہ تنظیمی اور حرکی قوت ہوتی ہے۔ یہ ہمارے افکار اور کردار میں وحدت پیدا کرتا ہے۔ قوائے عملیہ کو مہمیز کرتا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کو مربوط اور منظم کرتا ہے اور معاشرے کو بدلنے میں ایک اہم اور مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔ یہ توحید کے تصور کی حرکی قوت ہی تھی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں مدینے میں ایک ایسا معاشرہ قائم ہوا جس میں مہاجر اور انصار کی کوئی تمیز نہ تھی۔ غریب اور امیر کا کوئی فرق نہ تھا۔ زبان، رنگ، خون، وطن اور نسل کی کوئی تفریق نہ تھی۔ جس کی روحِ رواں صرف اور صرف محبت، اخوت، رواداری یعنی آدمیت کے احترام کا جذبہ تھا۔ خیالات میں تبدیلی ہمیشہ معاشرتی نظام میں تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔ اسی اصول کی بنا پر چودہ سو سال پہلے مدینے میں اسلامی معاشرہ قائم ہوا تھا اور یہی اصول آج احیائے اسلام کی تحریک کے پیچھے کارفرما ہے۔

۴۔ مذہب کی غایت عظمیٰ کیا ہے؟ اقبال کے الفاظ میں اس کی غایت عظمیٰ یہ "نہیں ہے کہ انسان بیٹھا ہوا زندگی کی حقیقت پر غور کیا کرے، بلکہ یہ ہے کہ زندگی کی سطح کو بتدریج بلند کرنے کے لیے ایک مربوط اور متناسب عمرانی نظام قائم کیا جائے۔" خوب سے خوب تر کی اس جستجو میں دنیا نے اسلام سے پہلے یکے بعد دیگرے دو اصولوں کی بنا پر معاشرے کی تشکیل کی تھی، ایک عدل و انتقام کا اصول اور دوسرا عفو و درگزر کا۔ موسیٰ کی شریعت "جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت کی شریعت تھی"۔ انھوں نے یہ کبھی نہیں کہا: "اے اسرائیل! برے لوگوں کو معاف کر دے۔" (تورات - سفر خروج)

اس کے برعکس حضرت عیسیٰ نے کہا: "تم سن چکے ہو کہ پہلے کیا کہا گیا تھا۔ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ پر میں تم سے کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا، بلکہ جو تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دے۔ جو تیرا کرتہ لے، اس کو چغہ بھی لے لینے دے۔ جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے، تو اس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔" انھوں نے یہ کبھی نہیں کہا: "شریروں اور بدکاروں کو ان کے اعمال کی سزا دو کہ آسمان کی بادشاہت کی طرح زمین کی بادشاہت میں بھی امن و امان قائم ہو۔"
(انجیل - متی ۵ : ۳۸ منہ)

لیکن حضرت عیسیٰ کے بعد ہم نے حرا کی پہاڑی پر محسنِ انسانیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا:

۱۔ "برائی کا بدلہ ہمیشہ نیکی سے دو۔" (قرآن - ۲۳ : ۹۶)

۲۔ "عاقبت کا گھر ان لوگوں کے لیے ہے جو برائی کو نیکی سے دفع کرتے ہیں۔" (قرآن - ۱۳ : ۲۲)

۳۔" جو تم پر ظلم کرے، تم بھی اسی طرح اور اسی قدر اس پر ظلم کرو۔ خدا سے ڈرو اور یقین کرو کہ خدا اپنے سے ڈرنے والوں سے پیار کرتا ہے۔" (قرآن ۔ ۲ : ۱۹۴)

۴۔" ہم نے (تورات میں) لکھ دیا ہے کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، دانت کے بدلے دانت اور زخم کے بدلے زخم۔" (قرآن ۔ ۵ : ۴۵)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی "ادھوری باتوں" کو مکمل کرنے کے لیے آئے تھے۔ آپ آئے اور آپ نے یہ کام بطریقِ احسن پورا کیا۔ آپ نے کہا کہ" تم دشمنوں سے درگزر کرو۔ اور" برائی کو نیکی کے ذریعے دور کرو" کیوں کہ یہی دنیا میں امن و آشتی قائم کرنے کا ذریعہ ہے۔" نیکی و بدی برابر نہیں۔ نیکی سے بدی کو دور کرو کہ اس سلوک سے وہ شخص جس کو تم سے عداوت ہے، تمھارا دوست بن جائے گا۔ یہ وہ طریقِ اخلاق ہے جس پر صرف صابر اور خوش قسمت انسان ہی عمل کرتے ہیں۔" (قرآن ۔ ۴۱ : ۳۴، ۳۵)

لیکن یہ عفو، صبر، تحمل اور درگزر کب تک ؟ اس وقت تک جب تک کہ کسی برائی کا اثر ایک شخصِ واحد کی ذات تک محدود رہے۔ جرم ایک فرد کا ہو اور اس کے اثرات کا معاشرے کے معاملات سے کوئی تعلق نہ ہو۔ مثلاً وعدہ خلافی کرنا، قرض لے کر واپس نہ کرنا وغیرہ۔ ایسے جرم کو معاف فرما دو تاکہ آپس میں محبت بڑھے شخصی لطف و کرم کو فروغ ہو اور دنیا میں امن و آشتی کا بول بالا ہو۔ یہ وہ موقع ہے جہاں حضرت عیسیٰ کی شریعت پر عمل عین اسلام ہے۔

لیکن دنیا میں ایسی برائیاں بھی ہیں جن کا ارتکاب تو ایک شخص کرتا ہے مگر اس کے گہرے اثرات پورے معاشرے پر پڑتے ہیں مثلاً قتل، چوری وغیرہ۔ یہ جرائم ایسے ہیں جن کا ارتکاب گو ایک فردِ واحد کرتا ہے لیکن ان کے اثرات اتنے وسیع اور گہرے ہوتے ہیں کہ پوری نوعِ انسانی ان کی لپیٹ میں آجاتی ہے۔ ایسے جرم کو معاف کرنے کا کوئی جواز نہیں۔" جس نے کسی شخص کو بغیر اس کے کہ وہ مرتکب قتل ہوا ہو یا اس نے زمین میں فساد برپا کیا ہو، قتل کر دیا ہو تو اس نے گویا ساری دنیا کو قتل کر دیا، اور جس نے ایک کو زندہ بچایا تو اس نے گویا ساری دنیا کو زندگی بخشی۔" (قرآن ۔ ۵ : ۳۲) ۔ یہ وہ موقع ہے جہاں حضرت موسیٰ کی شریعت پر عمل کرنا عین اسلام ہے۔ عفو و درگزر اخلاقی حیثیت سے ایک انسان کا بہترین وصف ہے، لیکن اگر یہ اس حد سے تجاوز کر کے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لے تو

وہ قانون کی سرحد میں آگیا، جہاں عفو گناہِ عظیم ہے۔ نوعِ انسانی کی بقا اور اس کا تحفظ قصاص اور با[illegible] ہی میں ہے۔

حضرت موسیٰ کی شریعت انتقام، قانون اور سیاست کی شریعت تھی۔ یہ دونوں شریعتیں اگ[illegible] الگ دنیا کے لیے بے کار تھیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے موسیٰ کے قانون اور عیسیٰ کے وعظ کو مکمل کیا۔ آ[illegible] نے ان دونوں عناصر کو جو الگ الگ تھے اعتدال کے ساتھ اس طرح ترتیب دیا کہ قانون کا عدل اور اخلا[illegible] رحم دونوں باہم مل گئے، اور حضرت عیسیٰؑ کا یہ قول پورا ہوا کہ "میرے بعد آنے والا میری ادھوری با[illegible] کو پورا کرے گا۔" اسلام کا عمرانی نظام نہ صرف عفو و رحم پر مبنی ہے اور نہ صرف عدل و انتقام پر۔ بلکہ ان دونوں عناصر کا ایک کامیاب امتزاج ہے۔ انفرادی سطح پر اگر وہ عفو و درگزر کا حامی ہے تو معاشر[illegible] سطح پر عدل و انصاف کا۔

[illegible]۔ اسلام غور و فکر کی نسبت عمل پر زیادہ زور دیتا ہے اور یہ لائحہ عمل ہے عفو و عدل کی سیرت میں اعتدال قائم رکھنا۔ عفو کی سیرت کا سرچشمہ توحید کا تصور ہے اور عدل کی سیرت کا رسالت کا تصور۔ توحید اس کی عمودی جہت کا تعین کرتی ہے تو رسالت اس کی افقی جہت کا۔ توحید انسان کا رشتہ خدا سے جوڑتی ہے اور یہ رشتہ جس قدر مستحکم ہوتا ہے، اسی قدر اس میں عفو و رحم کی سیرت پیدا ہوتی ہے۔ توحید کا تصور خدا کے رحیم و کریم ہونے کا تصور ہے، اس کے حی و قیوم ہونے کا تصور ہے، اس کی ذات کے پاک اور بے عیب ہونے کا تصور ہے، اس کے کسی ہمسر و شریک کے نہ ہونے کا تصور ہے۔ اس کے ہر شے سے بے نیاز ہونے کا تصور ہے، اس کے کائنات کی وجودیاتی اساس ہونے کا تصور ہے، کیا وہی اس کا خالق ہے اور رب بھی۔ وہ وجودِ مطلق ہے اور ہر شے اپنے وجود کے لیے اس کی محتاج۔ وہ عرش پر متمکن ہے لیکن دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ اس مفہوم توحید پر عقیدہ رکھنے والا کسی حال میں خدا سے غافل نہیں رہتا۔ صبر و شکر میں سے ایک حالت اس پر طاری رہتی۔ وہ صرف زبان ہی سے خدا کی وحدانیت کا اقرار نہیں کرتا، بلکہ اس کا دل بھی اس امر کی گواہی دیتا ہے اور اس کی ساری زندگی اس احساس کی تفسیر ہوتی ہے۔

خدا ہر شے سے بے نیاز ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ایک بے غرض تماشائی ہے۔ اسے اپنے بندوں کے دکھ درد، رنج و غم اور فلاح و بھلائی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ انسان کا خالق ہے

اپنے بندوں سے پیار ہے، جو ان کی فلاح کا خواہاں ہے اور جس سے بندے، اگر وہ چاہیں، تو ذاتی طور پر رابطہ قائم کر سکتے ہیں، کیوں کہ وہ ان کی شاہ رگ سے زیادہ ان کے قریب ہے۔ اس کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو کبھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔ وہ تو کہتا ہے کہ مجھے پکارو، میں تمھاری پکار سنوں گا۔ مجھ سے دعا مانگو میں تمھاری دعا قبول کروں گا۔ تم جہاں کہیں ہو، میں تمھارے ساتھ ہوں۔ ایسے خدا پر ایمان ایک طرف انسان میں خود نگری اور خود داری پیدا کرتا ہے، تو دوسری طرف اسے خدا کے سوا ہر شے کی غلامی سے نجات دلا دیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی نفع و نقصان پہنچانے والا نہیں، کوئی مارنے اور جلانے والا نہیں، کوئی مالک و مختار نہیں۔ اس لیے وہ ہر شے سے بے نیاز اور بے خوف ہو جاتا ہے۔ اس کی گردن کسی کے سامنے نہیں جھکتی۔ اس کا ہاتھ کسی کے سامنے نہیں پھیلتا۔ اس کے دل میں کسی کی بڑائی کا سکہ نہیں جمتا۔ وہ یاس، خوف اور رحزن کی بیماریوں سے محفوظ و مامون ہو جاتا ہے، اس کا دل اُمید، یقین اور اعتماد کا گہوارہ بن جاتا ہے اور انفرادی سطح پر وہ سراپا عفو و رحم بن جاتا ہے۔

توحید انسان کی انفرادی نشوونما کا اصول ہے۔ اس سے فرد میں تقوے کا اعلیٰ وصف پیدا ہوتا ہے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج سب اس خیرِ اعلیٰ کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اگر نماز پڑھنے، روزہ رکھنے، زکوٰۃ دینے اور حج کرنے کے باوجود کسی شخص میں تقوے کا وصف پیدا نہیں ہوتا، وہ متقی اور پرہیزگار نہیں بنتا، عفو و درگزر سے کام نہیں لیتا، تو گویا توحید کا نقش اس کے دل پر اچھی طرح ثبت نہیں ہوا۔ وہ توحید کے اعلیٰ مقام سے پیچھے رہ گیا۔ عمودی جہت میں اس کی پرواز نامکمل رہ گئی۔

۴۔ جس طرح توحید بندے کا خدا سے رشتہ جوڑتی ہے، اسی طرح رسالت بندے کا بندے سے رشتہ استوار کرتی ہے۔ توحید اسلام کی عمودی جہت کی نمایندگی کرتی ہے اور رسالت اس کی افقی جہت کی۔ یہ دونوں جہتیں ایک دوسرے کی ضد نہیں، بلکہ ایک دوسرے کی معاون و مددگار ہیں۔ یہ ایک دوسرے کو مکمل کرتی ہیں۔ خدا سے غافل ہو کر بندوں کے حقوق ادا نہیں کیے جا سکتے اور نہ بندوں کی حق تلفی کر کے خدا کی خوشنودی حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ توحید کی غایت ہے تقویٰ اور رسالت کی احترامِ آدمیت۔ تقوے کا ثمر ہے عفو و رحم اور احترامِ آدمیت کا عدل و احسان۔ یہی دو تصور اسلام کی فکری اساس ہیں اور یہی اس کے احیا کی لازمی شرائط۔

بندوں کا بندوں سے رشتہ جوڑنے کے لیے ضروری ہے کہ احترامِ آدمیت کی بنیاد پر زندگی کی سطح

کو بتدریج بلند کرنے کے لیے ایک مربوط اور متناسب عمرانی نظام قائم کیا جائے ، جس کی خصوصیات رسول اکرم نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں اس طرح بیان فرمائی ہیں :

" قریش کے لوگو ! خدا نے تمھاری نخوت کو ختم کر ڈالا اور باپ دادا کے کارناموں پر تمھارے فخر و مباہات کی اب کوئی گنجائش نہیں ۔ تمھارے خون ، مال اور عزتیں ایک دوسرے پر قطعی حرام ہیں ہمیشہ کے لیے ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : انسانو ! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے لو تمھیں جماعتوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا تاکہ تم پہچانے جا سکو ۔ تم میں زیادہ عزت اور بزرگی والا خدا کی نظروں میں وہی ہے ، جو خدا سے زیادہ ڈرنے والا ہے ۔ (اس آیت کی روشنی میں اب) نہ کسی عرب کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل ہے ، نہ کسی عجمی کو کسی عرب پر ۔ نہ کالا گورے سے افضل ہے اور نہ گورا کالے سے ۔ ہاں بزرگی اور فضیلت کا اگر کوئی معیار ہے تو وہ ہے تقویٰ ۔ "

یہ ہے وہ منشورِ انسانیت جو محسنِ انسانیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو دیا ۔ اس منشور کے تین بنیادی اصول ہیں : حریت ، مساوات اور اخوت ۔ انہی اصولوں پر معاشرتی زندگی کی اساس استوار کرنے سے احترامِ آدمیت کا حق ادا ہوتا ہے ۔

حریت تمام معاشرتی ، اخلاقی اور دینی اقدار کی اساس ہے ۔ دین میں جبر و اکراہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں ۔ فکر و عمل کی آزادی ہی کی بنیاد پر انسان اخلاقی جدوجہد میں حصہ لے سکتا ہے اور اسے اپنے اعمال کا ذمے دار قرار دیا جا سکتا ہے ۔ اس کے بغیر نہ اخلاقی جدوجہد کا تصور کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی نیکی بدی ، سزا و جزا اور جنت و دوزخ کا ۔ حریت سے مراد صرف سیاسی آزادی نہیں ، بلکہ ہر قسم کی غلامی سے نجات ہے جو خدا کی اطاعت ، شریعت کی پابندی ، اسوۂ حسنہ کی پیروی اور ضبطِ نفس کی راہ میں حائل ہو ۔ اعلیٰ سیرت اور بلند کردار کے حامل افراد صرف آزاد معاشرے میں پیدا ہو سکتے ہیں ۔

حریت اور مساوات میں چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا مساوی حقوق اور مساوی وسائل کے بغیر آزادی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے ۔ جب تک کہ ملت کے تمام افراد کو بلا امتیاز رنگ و خون ترقی کے یکساں مواقع حاصل نہ ہوں ، وہ صحیح معنوں میں آزادی کا حق استعمال نہیں کر سکتے اور نہ ہی ملت کے مفید رکن بن سکتے ہیں ۔ ترقی کے یکساں مواقع کی فراہمی مساوات کا ایک پہلو ہے ۔ اس کے دوسرے پہلو قانون اور معاشرے کی نظر میں برابری ہے ۔ شریعتِ الٰہی کے سا

بادشاہ اور گدا سب برابر ہیں۔ امیر و غریب سب کے لیے ایک ہی قانون ہے اور ایک ہی سزا۔ قانون کی گرفت سے کوئی شخص بالاتر نہیں ہے۔ قانونی مساوات کی طرح اسلام معاشرتی مساوات کا بھی داعی ہے۔ دولت و ثروت کا فرق کبھی اس کی راہ میں سنگِ گراں نہ بن سکا، کیوں کہ اس نے مساوات کی بنیاد انسان کی مادی احوال پر نہیں بلکہ اس کے روحانی تمول پر رکھی ہے۔ مسجد ہو یا خلیفۂ وقت کا دربار یا کوئی معاشرتی تہوار، امیر و غریب دونوں شانے سے شانہ ملائے ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں، مصافحہ کرتے ہیں اور گرم جوشی سے بغل گیر ہوتے ہیں۔

مساوات حریت کا مثبت پہلو ہے۔ اس کے بغیر حریت ایک منفی قدر ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن صرف مساوات سے سارے معاشرتی تقاضے پورے نہیں ہو جاتے۔ یہ معاشرتی زندگی کے صرف خارجی پہلو کو نمایاں کرتی ہے۔ اس کے داخلی پہلو کو اخوت کا جذبہ اجاگر کرتا ہے۔ جس کے بغیر نہ مساوات کا حق ادا ہوتا ہے اور نہ ہی معاشرتی زندگی میں کھاگھمی پیدا ہوتی ہے۔ معاشرے میں یگانگت اور وحدت کا احساس نہ قانونی مساوات سے پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی معاشرتی مساوات سے۔ کوئی قوم ایک اس وقت ہوتی ہے جب اس کے تمام افراد کے دل ایک ہوں۔ وہ اپنے قلب کی گہرائیوں میں یہ محسوس کریں کہ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں۔ اس لیے وہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، ایک دوسرے کے غم خوار اور بہی خواہ۔ بھائی کا بھائی سے رشتہ محبت والفت کا رشتہ ہوتا ہے، اس لیے اس سے یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ وہ مساوات کو ملحوظ نہیں رکھے گا یا عدل وانصاف سے پہلوتہی کرے گا۔

(۷)۔ ابھی تک ہم اسلام اور اس کے احیا کی مشترک فکری اساس سے بحث کر رہے تھے جس کا تعلق مسلمات یا اساسیاتِ اسلام سے ہے۔ ان کی حیثیت چوں کہ عمومی اور کلی اصولوں کی ہے جن میں وقت کے ساتھ کوئی تبدیلی نہیں آئی، اس لیے یہی آج اس کے احیا کی تحریک کے اصل محرک ہیں۔ نظری حیثیت سے بات یہاں ختم ہو جاتی ہے، لیکن عملی اعتبار سے اصل بات یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ جب ہم کسی قدیم نظریے پر آج کل کے حالات میں عمل کرنا شروع کرتے ہیں تو معاشرے کی بدلی ہوئی ساخت اور اس کا بدلا ہوا رنگ و آہنگ اس کی راہ میں طرح طرح کی مشکلات پیدا کرتا ہے، جن میں ایک عبادات کا معاملہ ہے اور ایک معاملات کا۔ جہاں تک معاملات کا تعلق ہے، ان کی نوعیت انفرادی کم اور معاشرتی زیادہ ہے۔ سائنس

کی روز افزوں ترقی نے معاشرے کی ہیئت اور اس کی ضروریات کو یکسر بدل دیا ہے۔ اس لیے ہمیں شرعی احکام پر عمل کرنے میں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ مشکلات ناقابلِ تسخیر نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ "اجتہادی گہرائیوں کو دوبارہ حاصل کرکے" معاملات سے متعلق "فکرِ دینی کو از سرِ نو" کیا جائے۔ وقت کی اس سب سے بڑی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اقبال نے اپنے مشہور خطبات کا نام، جو ۱۹۳۰ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئے، "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" رکھا، جس میں انھوں نے اجتہاد کے فقہی اصول کو اسلام میں حرکت اور ترقی کا اصول قرار دیا۔ اسی اصول کی بنیاد پر ایک بڑھتے ہوئے تمدن کی ضروریات کے پیشِ نظر پہلی صدی ہجری کے وسط سے لے کر چوتھی صدی ہجری کے آغاز تک عالمِ اسلام میں کم و بیش انیس مکاتبِ فقہ و قانون وجود میں آئے، جن میں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور شیعوں میں جعفریہ مکتبِ فکر زیادہ مقبول ہوئے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ مسلمانوں کی ہر نسل اسلاف کی رہنمائی میں اجتہاد کے ذریعے اپنے معاشرتی مسائل خود حل کرتی، لیکن ہوا یوں کہ ہم نے اجتہاد کے بجائے تقلید پر قناعت کرلی اور اس طرح شریعت کا ہماری زندگی سے رابطہ ٹوٹ گیا۔ اجتہاد کے دروازے بند کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج گیارہ سو سال کے بعد جب اس زبردست خلا کے پُر کرنے کی بات کی جاتی ہے تو یہ ہمیں ایک ناقابلِ عمل بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عصرِ حاضر کے روحانی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے "اجتہادی گہرائیوں کو دوبارہ حاصل کرکے" معاملات سے متعلق "فکرِ دینی کو از سرِ نو تعمیر کرنا" وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے، جس سے ہماری مراد قدیم علمِ کلام، دینیات اور اسلامی فقہ و قانون کی تعمیرِ نو ہے۔ عملی سطح پر یہ عصرِ حاضر میں احیائے اسلام کی لازمی شرط ہے جس پر بار بار زور دیتے ہوئے اقبال کبھی نہیں تھکتے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"زندگی کے متعلق ملت کے زاویۂ نگاہ کے دوش بدوش ملت کی روحانی ضرورتیں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ فرد کی حیثیت، اس کی دماغی نجات و آزادی اور طبعی علوم کی غیر متناہی ترقی ـــ ان چیزوں میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے، اس نے جدید زندگی کی اساس کو یکسر متغیر کردیا ہے۔ چنانچہ جس قسم کا علمِ کلام اور علمِ دین ازمنۂ وسطیٰ کے مسلمانوں کی تسکینِ قلب کے لیے کافی ہوتا تھا وہ آج تسکین بخش نہیں ہے ... اس سے مذہب کی روح کو صدمہ پہنچانا مقصود نہیں ہے۔ اجتہادی گہرائیوں کو دوبارہ حاصل کرنا مقصود ہے تو فکرِ دینی کو از سرِ نو تعمیر کرنا قطعاً لازمی ہے۔" (مکتوبِ اقبال بنام صاحبزادہ آفتاب احمد خاں،

مورخہ ۴ جون ۱۹۲۵ء)

" اسلام کی رو سے زندگی کی روحانی اساس ابدی ہے اور اپنے آپ کو تغیر و تنوع میں ظاہر کرتی ہے۔ جس معاشرے کی بنیاد حقیقت کے اس تصور پر ہو اسے چاہیے کہ اپنی زندگی میں ثبات و تغیر دونوں خصوصیات کا یکساں طور پر لحاظ رکھے۔ اس کے پاس ضرور کچھ ایسے ابدی اصول ہونے چاہئیں جو اجتماعی زندگی میں نظم و ربط قائم رکھیں، کیوں کہ ہر آن بدلتی ہوئی اس دنیا میں ہم اپنا قدم مضبوطی سے جما سکتے ہیں تو ان ہی کی بدولت۔ لیکن یہ ابدی اصول تغیر و تبدل کے امکانات کو بالکل ختم نہیں کر دیتے، کیوں کہ تغیر قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نشانی ہے جسے نظر انداز کر کے ہم اس شے کو جس کی فطرت ہی حرکت ہے، حرکت سے عاری کر دیں گے۔ سیاسی اور معاشرتی علوم میں یورپ کی ناکامی اول الذکر اصول کی مثال ہے اور گزشتہ پانچ سو سالوں میں اسلام کا جمود آخر الذکر اصول کی مثال۔ اسلام میں پھر حرکت کا یہ اصول کیا ہے۔ اس اصول کا نام اجتہاد ہے۔" (تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ)۔

" حالاتِ زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب آجانے کی وجہ سے بعض ایسی تمدنی ضروریات پیدا ہوگئی ہیں کہ فقہا کے استدلالات جن کے مجموعے کو عام طور پر شریعتِ اسلامی کہا جاتا ہے، ایک نظرِ ثانی کے محتاج ہیں۔ میرا یہ عندیہ نہیں کہ مسلّماتِ مذہب میں کوئی اندرونی نقص ہے، جس کے سبب سے وہ ہماری موجودہ تمدنی ضروریات پر حاوی نہیں ہیں، بلکہ میرا مدعا یہ ہے کہ قرآنِ شریف اور احادیث کے وسیع اصولوں کی بنا پر جو استدلال فقہا نے وقتاً فوقتاً کیے ہیں، ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو خاص خاص زمانوں کے لیے واقعی مناسب اور قابلِ عمل تھے، مگر حال کی ضروریات پر کافی طور پر حاوی نہیں ہیں۔ جس طرح اس وقت ہمیں تائید اصولِ مذہب کے لیے ایک جدید کلام کی ضرورت ہے، اسی طرح قانونِ اسلامی کی جدید تفسیر کے لیے ایک بہت بڑے فقیہ کی ضرورت ہے جس کے قوائے عقلیہ و متخیلہ کا پیمانہ اس قدر وسیع ہو کہ وہ مسلّماتِ مذہب کی بنا پر قانونِ اسلامی کو نہ صرف ایک جدید پیرائے میں مرتب اور منظم کر سکے بلکہ تخیل کے زور سے اصول کو ایسی وسعت دے سکے جو حال کے تمدنی تقاضوں کی تمام ممکن صورتوں پر حاوی ہو۔" ("قومی زندگی"، مخزن، اکتوبر ۱۹۰۴ء)

یہ ہے احیائے اسلام کی اصل فکری اساس۔ یہ دور ایک نئی فقہ، نئے علم کلام اور نئی دینیات کی تعمیر کے لیے ایک امام ابوحنیفہ اور امام فخرالدین رازی کا منتظر ہے۔

۸۔ یہ تو ہوئی بات اسلام اور اس کے احیا کے فکری اساس کی۔ اب آئیے احیائے اسلام کی تحریک کی طرف۔ ایک سوال یہاں رہ رہ کر ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جن اسلامی ممالک میں یہ تحریک ایک زبردست سیاسی طاقت بن کر ابھر رہی ہے، کیا ان ممالک میں تقوے اور احترامِ آدمیت، عفو اور عدل کی بنیاد پر معاشرے کی تعمیرِ نو کا کوئی امکان ہے؟ معاشرتی نظام میں تبدیلی حالات میں تبدیلی پر منحصر ہوتی ہے۔ دل و دماغ جب تک نہ بدلیں، اس وقت تک معاشرے میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ معاشرے کی تعمیرِ نو کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ہم صدقِ دل سے اخلاقی قوت کی برتری کو تسلیم کریں، روحانی تموّل کو اپنا شعار بنائیں اور طاقت کی دلیل کے بجائے دلیل کی طاقت سے اپنے مسائل حل کریں۔ اسلام کے نام پر سیاسی غلبہ حاصل کر لینے سے کوئی معاشرہ اسلامی معاشرہ نہیں بن جاتا۔ وہ اسلامی معاشرہ اس وقت بنتا ہے جب کہ اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی دونوں ان اقدار کی حامل ہوں جن کی اسلام نے ہمیں تلقین کی ہے۔ خدا کو بھلا کر، انسانیت کی تذلیل کر کے اسلامی معاشرے کی تعمیر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی تحریک اگر کامیاب ہوتی ہے تو عزم و خلوص کی بدولت۔ ناکام ہوتی ہے تو ان کی کمی اور فقدان سے۔ عزم و خلوص کا پیمانہ فکر و عمل میں ہم آہنگی ہے۔ قول و فعل میں تضاد سے ان دونوں کی نفی ہوتی ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس بنیاد پر مدینے میں اسلامی معاشرہ قائم کیا تھا، وہ صرف زبانی وعظ نہیں بلکہ ان کے ذاتی کردار کی ولولہ انگیز قوت تھی جس نے لوگوں کے دلوں میں ان کی تعلیمات پر عمل کرنے کا شوق اور جذبہ پیدا کیا اور وہ خلوص عطا کیا جو کسی عقیدے کے مطابق زندگی بسر کرنے کی لازمی شرط ہے۔ اکابرِ ملت کا کردار نہ کہ ان کا وعظ عوام الناس کے لیے مشعلِ راہ ہوتا ہے۔ زعمائے ملت اگر "گفتار کے غازی" ہوں تو عوام سے "کردار کے غازی" بننے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ قائدینِ ملت اگر "کردار کے غازی" ہوں تو عوام یقیناً ان کی تقلید کریں گے اور معاشرے میں خود بخود اخلاقی برتری کی بنیاد پر تبدیلی آتی جائے گی۔ ورنہ سامراجیت اور اشتراکیت کے مہلک نتائج کے خلاف ردِ عمل کے طور پر احیائے اسلام کی جو تحریک وسیع پیمانے پر شروع ہوئی ہے، اس کے خاطر خواہ نتائج نہیں نکلیں گے۔

بہرحال مایوسی کی ایسی کوئی بات نہیں۔ کعبے سے منہ موڑ کر صنم کدہ آباد کرنے کے نتائج نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں۔ ہم اپنی غلطی پر نادم اور پشیمان ہیں۔ "احساسِ زیاں" اتنا شدید ہے کہ ہم نے کعبے کو پھر جبینوں سے بسانے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے اور یہ فیصلہ ہم نے عالمی سطح پر اس ارضِ مقدس میں کیا ہے جو

کعبے کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔

عالمِ اسلام پہ ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو بڑے دکھ کے ساتھ ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اسلام اب صرف قرآن میں باقی رہ گیا ہے اور مسلمان قبروں میں۔ ہماری زندگی کا شریعتِ اسلامیہ سے رشتہ ایک دن میں منقطع نہیں ہوا ہے۔ جہاں تک برصغیر پاک و ہند کا تعلق ہے اس کی تاریخ سو سال کے عرصے پہ پھیلی ہوئی ہے۔ یہ اس نظامِ تعلیم کا ثمر ہے جو لارڈ میکالے نے ہم پر مسلط کیا تھا اور جس نے اگر ہمیں عیسائی نہیں بنایا تو مسلمان بھی نہیں رہنے دیا۔ اس نے غیر محسوس طریقے سے ہمارے خیالات اور رویوں کو متاثر کیا جس کے نتیجے میں ہماری زندگی کا شریعت سے رشتہ دن بدن کمزور ہوتا گیا اور اکبر الہ آبادی کی یہ پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی: "دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے" معاشرتی نظام میں تبدیلی کا انحصار خیالات میں تبدیلی پر ہوتا ہے۔ دل و دماغ جب تک نہ بدلیں، معاشرے میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ اسی اصول کے تحت سو سال پہلے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی زندگی کا اسلامی شریعت سے رشتہ منقطع ہونا شروع ہوا تھا۔ دونوں صورتوں میں انقلاب خیالات کے بدلنے سے آیا تھا۔ پہلے انقلاب نے اسلامی معاشرے کی داغ بیل ڈالی۔ دوسرے نے اس کی بیخ کنی کی۔ دونوں صورتوں میں انقلاب تعلیم کی بدولت آیا تھا۔ پہلا انقلاب اس مثبت تعلیم کے ذریعے آیا تھا جو محسنِ انسانیت رسولِ اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نوعِ انسانی کو دی اور دوسرا اس منفی تعلیم کے ذریعے جو لارڈ میکالے نے ہم پر مسلط کی۔ اب تیسرا انقلاب بھی اگر آئے گا تو تعلیم ہی کی بدولت آئے گا، کیوں کہ معاشرے میں تبدیلی لانے کا اگر کوئی مؤثر ذریعہ ہے تو وہ تعلیم ہے۔ تعلیم اگر بدل جائے تو لوگوں کے دل و دماغ خود بہ خود بدل جائیں گے۔

عالمِ اسلام کے سامنے اس وقت سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ مغربی استعماروں نے اپنے دورِ اقتدار میں جو نظامِ تعلیم مختلف مسلم ممالک پر مسلط کیا تھا آزاد ہونے کے بعد اب اسے بدلا کیسے جائے؟ ہر نو آزاد یا کافی عرصے سے آزاد مسلم ملک میں اس وقت دو دو نظامِ تعلیم رائج ہیں: ایک مدرسوں اور مکتبوں کا ملی نظامِ تعلیم، دوسرا استعماروں کا لایا ہوا اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا نظامِ تعلیم۔ پہلی نوع کے اداروں میں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ دنیا کا خالق خدا ہے۔ اس نے چھ دن میں زمین و آسمان اور جو کچھ اس میں ہے اسے پیدا کیا۔ اس نے مٹی سے آدم کا خمیر تیار کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی۔ سود لینا حرام ہے وغیرہ وغیرہ۔ دوسری نوع کے اداروں میں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ اس دنیا کا کوئی خالق نہیں۔ یہ خود بہ خود

میکانکی قوانین کے تحت وجود میں آئی۔ انسان خدا کی تخلیق نہیں، بندر کی اولاد ہے۔ سود سے پاک معیشت کا تصور ہی ناممکن ہے۔ تعلیم کی اس دوئیت کی بدولت معاشرہ وحدتِ افکار اور وحدتِ کردار سے عاری، مسٹر اور مولانا کے دو طبقوں میں بٹ گیا ہے جو ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ ایک طبقہ اگر زندگی کا شریعت سے رشتہ استوار کرنا چاہتا ہے تو دوسرا اس کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔ دنیائے اسلام کا اس وقت مشترکہ مسئلہ یہ ہے کہ ان دو مختلف تعلیمی نظاموں کو ایک مربوط تعلیمی نظام میں کس طرح سمویا جائے کہ ملّتِ اسلامیہ وحدتِ افکار اور وحدتِ کردار کا ایک مرقع بن جائے۔ اس مسئلے کو عالمی سطح پر حل کرنے کے لیے پہلا تعمیری قدم کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی، جدہ نے اٹھایا اور ۳۱ مارچ سے ۸ اپریل ۱۹۷۷ء تک مکہ معظمہ میں فرسٹ ورلڈ کانفرنس آن مسلم ایجوکیشن کے انعقاد کا اہتمام کیا۔ "اسلامک کنسیپٹس اینڈ کوری کلا" پر مختلف مسلم ممالک کے مندوبین پر مشتمل اس بین الاقوامی سیمینار میں جو مقالے پڑھے گئے انھیں ورلڈ آف اسلام فیسٹیول پبلشنگ کمپنی، لندن، نے نفسِ مضمون کے اعتبار سے سات الگ الگ کتابوں کی صورت میں شائع کیا ہے جن کے نام یہ ہیں:

۱۔ ڈاکٹر سید محمد النقیب العطّاس (مؤلف): ایمز اینڈ اوبجیکٹوز آف اسلامک ایجوکیشن۔

۲۔ ڈاکٹر سید ساجد حسین اور ڈاکٹر سید علی اشرف (مؤلفین): کرائی سس آن مسلم ایجوکیشن۔

۳۔ ڈاکٹر سید علی اشرف (مؤلف): مسلم ایجوکیشن ان دی ماڈرن ورلڈ۔

۴۔ ڈاکٹر وسیع اللہ خاں (مؤلف): ایجوکیشن اینڈ سوسائٹی ان دی ماڈرن ورلڈ۔

۵۔ پروفیسر حمید الآفندی اور پروفیسر نبی احمد بلوچ (مؤلفین): کوری کلم، سلیبائی اینڈ ٹیچر۔

۶۔ ڈاکٹر اسماعیل آر۔ الفاروقی اور ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف (مؤلفین): سوشل اینڈ نیچرل سائنسز، دی اسلامک پرس پیکٹو۔

۷۔ ڈاکٹر سید حسین نصر، فلوسوفی، لٹریچر اینڈ فائن آرٹس۔

پہلی کانفرنس میں جو کام ہوا تھا اُسے آگے بڑھانے کے لیے ۱۵ — ۲۰ مارچ ۱۹۸۰ء تک سیکنڈ ورلڈ کانفرنس آن مسلم ایجوکیشن کے انعقاد کا اہتمام وزارتِ تعلیم حکومت پاکستان نے کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی اور قائداعظم یونیورسٹی کے تعاون سے اسلام آباد میں کیا۔ اسلامک کنسیپٹس اینڈ کوری کلا پر اس دوسرے بین الاقوامی سیمینار میں جو مقالے پڑھے گئے، انھیں قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد نے دو جلدوں میں جمع کیا

ہے۔ کانفرنس نے جو سفارشات کی ہیں انھیں انگریزی اور عربی دونوں زبانوں میں ایک الگ کتابچے کی شکل دی ہے۔

پہلی عالمی کانفرنس نے متفقہ طور پر مسلمانوں کی تعلیم کے جو اغراض ومقاصد متعین کیے تھے وہ یہ ہیں:

"تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ انسان کی روح، ذہن، نفسِ ناطقہ، احساسات اور بدنی حواس کی تربیت کے ذریعے اس کی پوری شخصیت کی نشوونما کرے۔ اس لیے تعلیم کو انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر انسان کے روحانی، ذہنی، تخیلی، جسمانی، سائنسی، لسانی ہر پہلو کی نشوونما کا اہتمام کرنا چاہیے اور ان تمام پہلوؤں کو خیر اور کمال کے حصول کی لگن سے سرشار کرنا چاہیے۔ مسلمانوں کی تعلیم کی غایت الغایات اس بات پر منحصر ہے کہ انفرادی، اجتماعی اور پوری نسلِ انسانی کی سطح پر اللہ کی مکمل اطاعت کا مقصد پورا ہو۔"

"نصاب کی تدوین کرنے والے کا فرض ہے کہ وہ مندرجہ بالا مقاصد کو مدنظر رکھے اور جملہ علم جو اس وقت موجود ہے اس کی تنظیم اس طرح کرے کہ اس سے بہرہ ور ہونے والا ایسا نیک اور متقی انسان بنے جو یہ کہنے پر آمادہ ہو: "اے میرے خدا! میری عبادت، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے جو عالموں کا پروردگار ہے اور جس کا کوئی ثانی نہیں۔"

اس مقصد کے پیشِ نظر کانفرنس کے شرکا نے تمام علم کی جو اس وقت موجود ہے، ماخذ کی بنیاد پر "ابدی" (Perennial) اور "اکتسابی" (Acquired) علم کی تقسیم کی۔ قرآن اور حدیث سے حاصل ہونے والے علم کو "ابدی" اور عقل و تجربے سے حاصل ہونے والے علم کو "اکتسابی" علم کا نام دیا اور "اکتسابی" علم کے "ابدی" علم سے مربوط اور ہم آہنگ ہونے پر زور دیا، جس کی ان کے نزدیک صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ جلد از جلد "اکتسابی" علم کے ہر شعبے میں ایک اسلامی مدرسۂ فکر قائم کیا جائے جو ان علوم کو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کرنے کا فرض انجام دے۔ "اکتسابی" علم کی "ابدی" علم سے مکمل تربیط (integration) کے پیچھے جو مقصد کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ تمام مسلم ممالک میں آج کل بہ یک وقت جو دو دو نظامِ تعلیم رائج ہیں ان کو ایک نظامِ تعلیم میں اس طرح سمویا جائے کہ دونوں کے تمول میں اس سے اضافہ ہو اور کسی کو کسی قسم کا نقصان اس سے نہ پہنچے۔ ایسے مربوط نظامِ تعلیم ہی سے بہرہ ور ہو کر ملتِ اسلامیہ وحدتِ افکار اور وحدتِ کردار کا نمونہ بن سکتی ہے اور احیائے اسلام کی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔

"ابدی" اور "اکتسابی" علم کی تقسیم کا اطلاق مجموعی حیثیت سے تمام علم پر ہوتا ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

ابدی علم یا الٰہیات

۱۔ قرآنِ مجید: (ا) قرآت، حفظ اور تفسیر (ب) سنتِ نبوی (ج) سیرت النبیؐ، سیرتِ صحابہ و تابعین (جو اسلام کی ابتدائی تاریخ پر مشتمل ہے)۔ (د) توحید (ہ) فقہ اور اصولِ فقہ (ز) قرآنی عربی۔ علم الاصوات، علم الاعراب اور علم الدلالات (Semantics)

۲۔ ذیلی (Ancillary) علوم: (ا) اسلامی فلسفہ (ب) ادیانِ متقابلہ (ج) اسلامی ثقافت

اکتسابی علم

اس کا اطلاق مندرجہ ذیل علوم پر ہوگا۔

۱۔ فنونِ متخیلہ: فنِ تعمیر اور دوسرے اسلامی فنون، ادب اور زبانیں

۲۔ علومِ عقلیہ: عمرانی علوم (نظری)، فلسفہ، تعلیم، اقتصادیات، سیاسیات، تاریخ، اسلامی تہذیب (سیاسیات، اقتصادیات، معاشرتی زندگی، جنگ اور امن کے متعلق اسلامی نظریات جس میں شامل ہیں)، جغرافیہ، عمرانیات، لسانیات (زبانوں کو اسلامی رنگ دینا) نفسیات (بالخصوص قرآن و حدیث میں موجود اسلامی نظریۂ نفس جس کا تجزیہ اور توضیح ابتدائی دور کے مسلمان مفکرین اور بڑے بڑے صوفیا نے کی ہے)، علم الانسان (جیسا کہ قرآن و سنت سے اخذ کیا جا سکتا ہے)۔

۳۔ علومِ طبعیہ: (نظری) فلسفہ سائنس، ریاضی، شماریات، طبعیات، کیمیا، حیاتیاتی علوم، فلکیات، خلائی سائنسز وغیرہ۔

۴۔ اطلاقی (Applied) علوم: انجنیئرنگ اور ٹیکنولوجی، سول، مکینیکل وغیرہ، علم الادویہ (طب، ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی)، بیطاری (Veterinary)، زراعت اور جنگلات کی سائنس۔

۵۔ عملی علوم: کامرس، ایڈمنسٹریٹو سائنسز (بزنس ایڈمنسٹریشن، پبلک ایڈمنسٹریشن وغیرہ)، لائبریری سائنسز، امورِ خانہ داری سے متعلق علوم، ابلاغی علوم (ابلاغِ عامہ وغیرہ)

علومِ مکتسبہ کی ان تمام انواع کا اسلامی نقطۂ نظر سے پڑھانے کا اہتمام کرنا احیائے اسلام کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے ازبس ضروری ہے۔ طبعی اور عمرانی علوم کے ہر شعبے میں ایک اسلامی مدرسۂ فکر کا قیام وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اکتسابی علوم کو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کیے بغیر ایک مربوط نظامِ تعلیم کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور نہ نظامِ تعلیم کی موجودہ دوئیت کو ختم کیا جا سکتا ہے جس نے ہمیں تباہی کے غار کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا ہے۔

پہلی عالمی کانفرنس کی ان سفارشات کی روشنی میں، جن کی تائید دوسری کانفرنس میں کی گئی، بلاخوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ احیائے اسلام کی اس تحریک کی کامیابی میں دیر لگ سکتی ہے، لیکن یہ ناکام ہرگز نہیں ہو سکتی۔